مولانا محمد حنیف ندوی

اسلام کا تصورِ ثقافت

(۲)

اسلامی ثقافت کے مسئلہ پر دو پہلوؤں سے گفتگو ممکن ہے یعنی مسلمانوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں تہذیب و تمدن کے کن سانچوں کو اپنایا اور یہ کہ نظریاتی اعتبار سے اسلامی ثقافت کے خدوخال کیا ہیں۔ ہر اعتبار سے یہ دو الگ الگ سوال ہیں۔ ہمارا موضوع بحث یہ نہیں کہ اسلامی ثقافت نے ماضی میں تعمیر، خطاطی، ادب و فن اور معاشرہ میں، حسن و جمال کی کن کن اداؤں کو سمویا ہے۔ یا عالم انسانی کے تہذیبی ورثہ میں، اسلامی تعلیمات کی بدولت کن انمول عناصر کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ ایک وسیع تر اور دلچسپ موضوع ہے جس کے بارہ میں بہت کچھ ضبطِ تحریر میں آچکا ہے۔ اور آئندہ بہت کچھ ضبطِ تحریر میں آنے کی توقع ہے۔

ہمارے دائرۂ بحث کا تعلق حال و مستقبل کی کروٹوں سے ہے، ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ آج ہمیں کن بنیادوں پر معاشرہ کی تعمیرِ نو کا فریضہ انجام دینا چاہیے۔ اور کن اصولوں اور پیمانوں کی روشنی میں اسلامی ثقافت کی نعمتوں کو عام کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ان اصولوں کو جانے بوجھے بغیر ہم ثقافت و تہذیب کے نقشہ میں اس شعوری منصر کو شامل نہیں کر سکتے جو اس کو بے راہ روی سے بچا سکے۔ اور اس کے لیے صحیح معنوں میں رنگ و روغن مہیا کر سکے۔

ان اصولوں اور پیمانوں سے آگہی ہونے کے دو اسلوب ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے براہِ راست اور مختصر انداز میں ان کی نشاندہی کر دی جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ اس دور کے مسائل کے حوالے سے ان کی مزید تشریح کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ اسلام ان سے متعلق کیا موقف اختیار کرتا ہے۔

ہم کوشش کریں گے کہ بحث و فکر کے ان دونوں طریقوں کو آزمائیں۔

اسلام ایک "کل" سے تعبیر ہے

اسلام کے تہذیبی اور ثقافتی پیمانوں کا ذکر چھڑا ہے تو ہاتھ کے ہاتھ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اسلام ایک "کل" (whole) یا مجموعہ ہے اور اس کا تعلق زندگی کی کسی ایک ہی شاخ سے نہیں۔ بلکہ اس دبستاں یا پیڑ سے ہے جس کی شمیم آرائیوں سے عالمِ انسانی سے بہرہ مند ہے اور فکر و عقیدہ، یا اخلاق و معاشرت کی ابواب و فصول میں تقسیم تاریخی ہے۔ اور علم و ادراک کے ارتقا کے نتیجے میں ابھری ہے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ہم ان ابواب و فصول کے مشمولات کو پوری طرح سمجھ سکیں۔ یہ نہیں کہ یہ ابواب و عنوان اس 'کل' سے کٹ کر الگ اپنا وجود قائم کر لیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ تہذیب و تمدن کے مسائل طے کرتے وقت اس کی روح، اس کی اصل، اور کلیت کو نظر انداز کر کے کوئی فیصلہ کیا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ ماضی میں تقسیم کی روشنی میں ہمارے ہاں علم الکلام کے نام سے گرانقدر فکری ذخیرہ معرضِ وجود میں آیا ہے، یہ بھی درست ہے کہ فقہ تفسیر، تاریخ، تصوف اور مدنیت کے متعلقات سے ہمارے ہاں جس نہج سے کام ہوا ہے۔ یا ہماری علمی نشاط آفرینیوں نے جس انداز سے زندگی کی زلف و کاکل کو سنوارا اور سجایا ہے ہمیں اس پر بجا طور سے فخر و ناز ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ علم و عمل کی اس پوری تگ و دو میں اسلام کی روح اور کلیت بہر حال کارفرما رہی ہے۔ اور ہم نے اسلامی تہذیب، اور مسلمانوں کی تہذیب میں فرق و امتیاز کے جو طبعی حدود ہیں ان کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے۔

صحت فکر اور علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ تعمیرِ نو کے اس مرحلہ میں ہم اس حقیقت کو کھلے بندوں تسلیم کر لیں کہ عہدِ ماضی میں ہم سے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ ہم نے غیر صحت مند تمدنی رجحانات کو نہ صرف اپنایا اور قبول کیا ہے بلکہ ان کی پرورش بھی کی ہے اور ایسے تصورات کو اسلامی سمجھ کر سینے سے چمٹائے بھی رکھا ہے۔ جن کا اسلامی روح سے، اسلام کے مزاج سے اور اسلامی تعلیمات سے دور کا تعلق بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس اعتراف سے دو گونہ فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک تو ماضی میں جو کچھ ہوا ہے اس کی جوابدہی سے ہم بچ جائیں گے۔ دوسرے اس تضاد سے ہم مخلصی حاصل کر لیں گے جو اسلام اور مسلمان کو مترادف سمجھ لینے سے پیدا ہوتا ہے۔

دین کو زندگی کے الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دینے سے کیا کیا نقصان لاحق ہوتے ہیں۔ اس کا

تجربہ ماضی میں ہو چکا ہے یہودیوں کو دیکھیے، ان کے ہاں تعلیمات کی اساس لوگوس (Logos) پر استوار ہے۔ اور "لوگاس" کے مفہوم میں جہاں فقہ و شریعت کی تفصیلات داخل ہیں، وہاں وہ روحانی اور انسانیت پر مبنی اصول اور پیمانے بھی داخل ہیں۔ جن سے شریعت کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے۔ لیکن یہودیوں کی بدنصیبی ملاحظہ ہو۔ انھوں نے شریعت و فقہ کو صرف اس حیثیت سے جاننے کی کوشش کی کہ اس سے قانون اور ضابطے کے تقاضے کہاں تک پورے ہوتے ہیں۔ یا قومی سطح پر اس کو حصولِ زر کا کیونکر ذریعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف ان میں جمود، تعصب اور تنگ نظری پیدا ہوئی اور قانون و ضابطے کی وسعتوں نے بڑھ کر زندگی کی طرفہ طرازیوں کا گلا گھونٹ دیا۔ اور دوسری طرف لالچ، جھوٹ اور سُود خوری نے انھیں دنیا بھر کی قوموں میں رسوا کر دیا۔ قرآن حکیم نے ان کی ان بُرائیوں کی وضاحت سے نشاندہی کی ہے:

سمّٰعون للکذب اکّٰلون للسحت۔ یہ بڑے حرام خور اور بڑے جھوٹ سننے والے ہیں۔ (مائدہ: ۴۲)

ظاہر ہے جب بھی کوئی تہذیب اپنے روحانی اور معنوی لطائف سے محرومی اختیار کرے گی اس کا یہی حشر ہوگا۔ دُور کیوں جائیے۔ اپنی ہی تاریخ پر ایک نظر کیوں نہ ڈال لیں۔ کیا ہم نے وحدت دینی کو پارہ پارہ کر کے اسی نوع کی مضرتوں کو دعوت نہیں دی۔ ہمارے ہاں علم الکلام پر اس حیثیت سے کام ہوا کہ یہ یونانی فلسفہ کی ایک شاخ ہے۔ لہٰذا اس میں وہی خشک، بے جان اور گمراہ کُن موشگافیاں در آئیں جو صدیوں سے فلسفہ و فکر کے حلقوں میں مابہ النزاع تھیں۔ تصوّف اسلام کے مقابلے میں ایک مستقل بالذات نظام کی حیثیت سے اُبھرا جس کا یہ دعویٰ تھا کہ تعلق باللہ اور عبودیت و ولایت کے رشتوں کو ریاضت و مجاہدہ سے ہر ہر شخص براہِ راست استوار کر سکتا ہے۔ اسی طرح فقہ کے معنی ہمارے ہاں یہ تھے کہ نئے نئے پیش آئند مسائل کتاب اللہ اور سنت کو بحیثیت مجموعی فکر و نظر کے سامنے رکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس کی تعلیمات کی روشنی میں ان مسائل کا کیا حل نکلتا ہے۔ اس کے بجائے ہوا یہ کہ فقہ ایک جُداگانہ فن قرار پائی اور مسائل کے حل و کشود کے لیے ایسے اصول اور پیمانے وضع کیے گئے جو ایک طرف ان روحانی و اخلاقی اقدار سے بیگانہ تھے جن سے اسلامی فقہ ترتیب پاتی ہے اور دوسری طرف جن کی صحت کے بارے میں قیل و قال کی کافی گنجائش تھی۔

اس پر مستزاد یہ کہ بغیر کسی اجتماعی اور معاشرتی ضرورت اور تقاضے کے شاخ در شاخ مسائل تراشے گئے۔ اس اندازِ اجتہاد کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ فقہ جسے زندگی کے مسائل حل کرنا تھے، جسے فکر و کاوش کی تازہ کاریوں سے تہذیب و تمدن کے قافلے کو آگے بڑھانا تھا۔ اس طرح سے زندگی کی گرانباریوں میں اضافے کا موجب بنی۔

ہم جب یہ کہتے ہیں کہ دین ایک وحدت ہے، ایک غیر منقسم اکائی ہے، یا ایک مجموعہ اور 'کل' ہے، تو اس کے دائرۂ اطلاق میں یہ تین نکات آتے ہیں:

۱۔ کسی بھی تہذیبی اور ثقافتی سوال پر اس جہت سے غور نہ کیا جائے کہ اسلامی روح، اسلامی تعلیمات اور اسلام کے کلی تقاضوں سے علیحدہ ایک اشکال ہے بلکہ اس نقطۂ نظر سے سوچا جائے کہ اسلامی تعلیمات جو عقائد سے لے کر اجتماعیات تک کی وسعتوں پر حاوی ہیں، ایک دوسرے پر مبنی، ایک دوسرے سے وابستہ، اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہیں۔ ان کا مزاج اجتماعی اور کلی ہے۔ اس لیے کسی مسئلہ کے بارہ میں فیصلہ کرتے وقت ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام بحیثیت مجموعی اس معاملہ میں ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے۔

۲۔ اسلام چونکہ ایک 'کل' سے تعبیر ہے اس لیے یہ جسم و روح کے تقاضوں میں کسی طرح کی دوئی یا ثنویت فرض نہیں کرتا بلکہ ہر اس عمل کو روح کا عمل سمجھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی خاطر کیا جائے۔

۳۔ اسلام زندگی کی سیاسی یا تہذیبی نشاط آفرینیوں کے بارہ میں دینی (Theocratic) اور غیر دینی (secular) کی دو ٹوک تفریق کا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک اگر کوئی اصلاحی تدبیر اور ارتقائی اقدام معاشرہ کی فلاح پر مبنی ہے اور اس کی بجاآوری سے اسلامی اقدار فروغ پاتی ہیں۔ اخوت اور بھائی چارہ کے جذبات کو تقویت ملتی ہے، ملت آگے بڑھتی ہے اور مشکلات بجا طور سے دور ہوتی ہیں، تو وہ عین دین اور عین اسلام ہے۔ اس لیے کہ نیکی، اصلاح اور ترقی کی ایک یہی شکل یا ایک ہی بندھا ٹکا اسلوب نہیں ہے بلکہ اس کی متعدد صورتیں اور سانچے ہیں جو زمانہ کے تغیر و انقلاب کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

(باقی آئندہ)